ماہ تک ان کے قائم مقام کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ انگلستان میں قیام کے دوران وقت کے چوٹی کے علماء وفضلاء کے ساتھ رابطہ رہا۔

ولایت سے واپسی پر آپ لاہور آ گئے اور یہاں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۲۶ء میں دوستوں کے اصرار پر پنجاب کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہوئے اور کامیاب ہوئے۔ تین سال تک اس منصب پر رہے اور ملک وقوم کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ آپ کی عظمت کے اعتراف میں برطانوی سرکار نے سر کا خطاب دیا' مگر اُن کی نگاہ میں ان خطابات کی کوئی اہمیت نہ تھی' کیونکہ وہ کسی اور ہی جہاں میں رہتے تھے۔ شعر کہنے کی صلاحیت ان کے اندر کمال کی تھی۔ ابتداء میں جب وقت کے معروف ترین شاعر داغ دہلوی کو اصلاح کے لئے نظمیں بھیجیں تو وہ آپ کے ملکہ شعر گوئی سے متاثر ہوئے اور بعدازاں اقبال کا استاد ہونے پر فخر کرتے رہے۔ اقبال کی شاعری اگرچہ فنی خوبیوں سے بھی مالا مال تھی تاہم ان کا مقصد صرف شعر گوئی یا شعر برائے شعر نہ تھا بلکہ وہ مسلمان قوم کا درد اپنے دل میں محسوس کرتے تھے اور انہوں نے اسی جذبے کو خوبصورت اشعار میں ظاہر کر کے ملت اسلامیہ کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

علامہ اقبال نے قانون کی پریکٹس بھی کی' لیکن شاعرانہ دل' فلسفیانہ مزاج' صوفیانہ طبیعت اور جستجوئے علم کا ذوق رکھنے والے شخص کو وکالت سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وکالت کو چھوڑا اور پوری توجہ کے ساتھ ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود کے کام میں لگ گئے۔ ۱۹۲۸ء میں آپ کو انجمن اسلامیہ مدراس نے اسلام پر لیکچر دینے کی دعوت دی۔ چنانچہ آپ نے چھ لیکچر دیئے۔ ان لیکچرز کو قبول عام حاصل ہوا۔ اب یہ کتابی صورت میں دستیاب ہیں۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں سرکار برطانیہ نے آپ کو گول میز کانفرنس میں نمائندہ مقرر کر کے لندن بھیجا۔

جدّ و جُہدِ آزادی

مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۳۰ء میں آپ نے اپنے صدارتی خطبہ میں مسلمانانِ ہند کے لئے ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے قیام کا مطالبہ پیش کیا جو

برصغیر کے شمال مغربی علاقوں پر مشتمل ہو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہ وہ سرزمین ہوگی جہاں مسلمان آئیڈیل اسلامی ریاست قائم کریں گے۔ علامہ اقبال کے یہ الفاظ الہامی ثابت ہوئے اور محمد علی جناح کی آواز پر مسلم قوم نے لبیک کہا۔ چنانچہ نہ صرف انگریز کو برصغیر سے نکل جانا پڑا بلکہ مسلمانوں کو پاکستان کی صورت میں ایک خطہ ارض مل گیا۔ علامہ اقبال کی وفات کو ابھی پورے دس سال نہ گزرے تھے کہ مصورِ پاکستان کے خواب کی تعبیر نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔

علامہ اقبال کا سادہ اندازِ زندگی ہر شخص کو متاثر کرتا تھا۔ ان کا لباس سادہ، رہائش سادہ اور گفتگو بھی سادہ ہوتی تھی۔ ان کی زندگی کا ہر پہلو سادگی کا نمونہ تھا۔ تکلفات کو آپ ناپسند کرتے تھے۔ آپ کا دروازہ ہر چھوٹے بڑے کے لئے کھلا رہتا۔ جو شخص بھی ملاقات کا خواہش مند ہوتا بلا کسی رکاوٹ کے آپ کو مل سکتا تھا۔

علامہ اقبال نے کبھی نمایاں ہونے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن ان کا با مقصد زندگی گزارنے کا انداز اس قدر پرکشش تھا کہ جلد ہی شہرت کے آسمان کے تارے بن گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بین الاقوامی شخصیت بن گئے۔ جوں جوں وقت گزر رہا ہے آپ کے مقام و مرتبہ کے کئی دوسرے پہلو ظاہر ہو رہے ہیں اور ان کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

علامہ اقبال کا دل سوز و گداز کا خزینہ تھا۔ امت کے درد کو اس قدر محسوس کرتے کہ ملت کی بے حسی کا تذکرہ کرتے کرتے اکثر رونے لگتے۔ رسول اللہ ﷺ کی محبّت میں فنا تھے۔ آپ ﷺ کا نام زبان پر آتے ہی جلتی ہوئی شمع کی طرح پگھلنے لگتے۔ درود شریف کثرت سے پڑھتے۔ ان کے نزدیک محبوبِ خدا کے ساتھ محبت ہی انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہے۔ آپ کے کلام میں سوزِ عشق مصطفیٰ ﷺ نمایاں ہے۔ آپ تنہائی پسند تھے اور یہ کوئی عجیب بات نہیں کیونکہ مفکر غور و فکر میں ڈوب کر ہی گوہرِ مقصود حاصل کرتا ہے۔ علامہ اقبال ماں باپ کی قدر و منزلت سے آگاہ تھے۔ والدہ سے حد درجہ محبّت اور الفت رکھتے تھے۔ جب وہ فوت ہوئیں تو آپ برطانیہ میں تھے۔ اس

صدمے پر آپ نے ایک طویل نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' لکھی جو والہانہ جذباتِ محبت سے بھری پڑی ہے۔

آج پاکستان کے قیام کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے مگر اس مملکتِ خداداد میں اسلامی نظام کے نفاذ کی آرزو پوری نہیں ہوسکی۔ مصوّرِ پاکستان اور بانیٔ پاکستان تو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے بعد ملک کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ آئی جن کے دل میں نہ قومی جذبہ تھا اور نہ ہی انہیں مسلمانوں کا مفاد عزیز تھا۔ اگر عزیز تھا تو صرف ذاتی مفاد کہ اس ملک کا اقتدار تادیر سنبھالے رکھیں اور اتنی دولت اکٹھی کر لیں کہ پشتہا پشت تک کے لئے کافی ہو۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں ملک کا یہی انجام ہونا تھا کہ باشندگان پاکستان کا بچہ بچہ بین الاقوامی قرضوں کے نیچے دبا ہوا ہے اور امن وامان کی حالت ناگفتہ بہ ہوچکی ہے۔ پورا معاشرہ جرائم کی زد میں ہے۔ اقوامِ عالم کی نگاہ میں اس سرزمین کا وقار ختم ہو چکا ہے۔

آج بھی ملک کو اگر صالح قیادت میسر آ جائے، قرآن وسنّت کا نظام نافذ کر دیا جائے اور اقبال کے افکار سے راہنمائی حاصل کی جائے تو مسلمانانِ پاکستان اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتے ہیں اور یہی خطّہ اقوامِ عالم کے لئے امن وامان اور سطوت و عظمت کے لحاظ سے مثالی سرزمین بن سکتا ہے۔ ؎

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹّی بہت زرخیز ہے ساقی!

علامہ اقبال بنیادی طور پر سیاست دان نہ تھے اور نہ ہی انہیں عملی سیاست سے کوئی دلچسپی تھی۔ اس کی وجہ اس کے سوا کوئی اور نہیں تھی کہ انہیں نمایاں ہونے کا کسی درجہ میں بھی شوق نہ تھا اور نہ ہی وہ شہرت کے خواہاں تھے۔ البتہ مسلمانوں کی حالتِ زار انہیں خون کے آنسو رلاتی تھی۔ ان کی نگاہِ دُوربیں مستقبل میں مسلمانوں کے حالات دیکھ رہی تھی۔ یہ صورت حال ان کے حسّاس دل کے لئے قابلِ برداشت نہ تھی لہٰذا وہ مسلم امّہ کو درپیش مسائل کا حل ڈھونڈنے میں غور وفکر کرتے تھے جس کے نتیجہ میں انہوں نے

محسوس کرلیا کہ برِصغیر کے لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ اوّل وہ انگریزوں کو برصغیر سے نکالیں اور بعدہٗ مسلمان ایک آزاد وخود مختار ریاست قائم کر کے ہندوؤں کے تسلّط سے بھی آزاد ہوں۔ یہ تجویز آپ نے اُس وقت پیش کی جب دُور دُور تک انگریز کی غلامی سے نکلنے کے بھی آثار نہ تھے۔ چہ جائیکہ مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ سرزمین کے حصول کے امکان کے متعلق سوچا جائے۔

چنانچہ یہ آپ کے سیاسی تدبر کا شاہکار ہے کہ آپ نے برصغیر کے شمال مغربی علاقہ جات پر مشتمل، جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی ایک آزاد مسلم ریاست کی تشکیل کا اشارہ دیا اور اس منصوبے پر عمل درآمد میں ہی برصغیر کی نجات تھی۔ حصولِ آزادی کے اس پروگرام کا نقشہ تیار کر کے اس کے لئے قائد کی تلاش ہوئی تو مضبوط اعصاب کے مالک اور پرخلوص شخصیت محمد علی جناح کی صورت میں مل گئی۔ علامہ اقبال نے خود جناح صاحب کو ان کے اندر موجود صلاحیتوں اور مقام سے آگاہ کیا۔ یقیناً یہ بات بھی ان کی سیاسی بصیرت کا شاہکار ہے۔ علامہ اقبال ایک متواضع اور منکسر المزاج شخصیت تھے۔ انہوں نے جناح صاحب کو مسلمانوں کی قیادت پر آمادہ کیا۔ اس طرح حصول آزادی کا یہ سفر شروع ہو گیا۔ ابتداءً آپ نے سیاسی مزاج نہ ہونے کے باوجود جناح صاحب کے ساتھ کام کرتے ہوئے مسلم لیگ کی ایک صوبائی شاخ کے صدر کے طور پر کام کرنا بھی منظور کرلیا۔ جدّوجہد آزادی کا آغاز ہوا۔ پاکستان کے تصوراتی نقشے میں رنگ بھرنے کا وقت آ گیا۔ پُرخلوص قائدین کی دن رات کی کوششوں کے نتیجہ میں اور لاکھوں جانوں کی قربانیاں دے کر آزاد وطن حاصل ہو گیا مگر افسوس مسلمانوں نے آزادی کی اس نعمت کی کسی درجے میں بھی قدر نہ کی۔ اس آزاد سرزمین پر نظامِ اسلام تو کیا نافذ کرتے اس کو سنبھال بھی نہ سکے۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کا ایک بازو اس سے علیحدہ ہو گیا۔ یہ بہت بڑا صدمہ تھا مگر افسوس کہ اس سے بھی نہ کوئی عبرت پکڑی گئی اور نہ ہی سبق سیکھا گیا بلکہ بد سے بدتر کی طرف چلتے گئے۔ آج حالت یہ ہے کہ جس سرزمین کو اتنی لمبی جدوجہد کے بعد اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا وہاں اسلام تو

کیا نافذ ہوتا اسلام سے دوری میں اضافہ ہوتا گیا اور اب اسے سیکولر سوشلسٹ اسٹیٹ بنانے کے پروگرام بن رہے ہیں۔

قیامِ پاکستان پر ہمیں قائدین تحریکِ پاکستان خاص طور پر علامہ اقبال کے احسان کو ماننا چاہئے تھا۔ مگر ہم نے نہ صرف ان کے احسان کو فراموش کیا بلکہ آزاد وطن کی بھی قدر نہ کی۔ حالات کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اگر خدانخواستہ پاکستان قائم نہ ہوتا تو ہندوؤں کی عیّاری اور مکّاری کے نتیجہ میں ہندوستان سے اسلام کا خاتمہ ہو چکا ہوتا بلکہ پورا مشرقِ وسطیٰ ہندوؤں کے تسلّط میں چلا جاتا۔

اگر مجدّد الفِ ثانیؒ کی جد و جہد جو انہوں نے اکبر اعظم کے دین الٰہی کے خلاف کی تھی انتہائی بروقت اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی تو علامہ اقبال کی مسلمانانِ ہند کے لئے ایک علیحدہ آزاد و خود مختار مملکت کے حصول کی کوششیں اس سے بھی زیادہ کامیاب ہوئیں کیونکہ علامہ اقبال کی وفات پر ابھی دس سال ہی گزر رہے تھے کہ برصغیر کے مسلمانوں کو پاکستان کی صورت میں آزاد اور خود مختار مملکت میں آزادی کا سانس لینا نصیب ہوا۔

حیرت ہوتی ہے کہ ہندی مسلمانوں کے قومی مسائل کا ذکر علامہ کی شاعری میں نظر نہیں آتا۔ مگر تھوڑے سے غور و فکر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کی شخصیت محدودیت کی قائل نہیں تھی۔ ان کی شاعری کے ابتدائی دور میں وطن کی محبّت کے ترانے ہیں، مگر جب وہ مسلمانوں کی زبوں حالی کو دیکھتے ہیں تو ان کی شاعری کا رخ دفعتاً بدل جاتا ہے اور وہ عالمی ملّتِ اسلامیہ کا درد محسوس کرنے لگتے ہیں اور وہ ''ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا'' اور ''میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے'' کا انداز چھوڑ کر ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' کہنے لگتے ہیں۔ یعنی اوّل اوّل وہ ہندی قوم پرست شاعر اور بعد ازاں ملّتِ اسلامیہ کے نقیب کی حیثیت سے نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ بات واقعی درست ہے کہ جداگانہ قومی تشخص کے مسئلے کو سیاسی اعتبار سے آپ نے بہت اہمیت دی اور برصغیر کے مسلمانوں میں دو قومی نظریئے کو اجاگر کیا، مگر اس ضمن میں انہوں نے شعر کا ذریعہ اختیار نہیں کیا بلکہ عملی جدّ و جُہد کو اپنایا۔

علّامہ نے اُمّتِ مسلمہ کی کج روی کے نتیجہ میں اس کی بربادی کا تذکرہ مرثیہ کے انداز میں کیا ہے، مگر صرف اسی پر اکتفانہیں کیا بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو ان کا شاندار ماضی بھی یاد دلایا ہے۔ اس طرح انہوں نے شبلی و حالی کے خیالات کی ترجمانی کی۔ مولانا حالی نے اُمت کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

اور ع

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اب دیکھئے وہ نظم جو صقلیہ (جزیرہ سسلی) پر علامہ نے کہی۔ ع

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار! وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور
مُردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہوا آدمی آزاد زنجیرِ توہّم سے ہوا
غلغلوں سے جس کے لذّت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے؟

اسی طرح بانگ درا میں ''بلادِ اسلامیہ'' کی یاد میں لکھی گئی نظم دیکھئے جس میں دلّی، بغداد، قرطبہ اور قسطنطنیہ جیسے عالی شان اسلامی شہروں کی عظمت و رفعت کا مرثیہ انتہائی دل سوزی کے ساتھ کہا ہے۔ اسی طرح ''بالِ جبریل'' کی طویل نظم جو ''مسجدِ قرطبہ''

کے عنوان سے موجود ہے، پڑھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کے دل میں ملّتِ اسلامیہ کے لئے کس قدر درد موجود تھا۔

چونکہ اقبال کی شاعری مقصدیت سے بھرپور ہے اس لئے وہ اُمّتِ مسلمہ کی خستہ حالی کا ذکر تو کرتا ہے مگر اسی پر بس نہیں کرتا، بلکہ وہ مسلمانوں کو ان کا تابناک ماضی اور اُن کے اسلاف کے شاندار کارنامے یاد کراتا اور جرأت وشجاعت کا درس دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی گزشتہ عظیم روایات کو بحال کرنے کا پختہ عزم کر کے بھرپور جدوجہد کا آغاز کر دینا چاہئے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ ان کو بتاتا ہے کہ یہ بات لوہے پر لکیر ہے کہ اُمت مسلمہ اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گی۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا!

یہ کہہ کر وہ مسلمانوں کو ماضی یاد دلاتا ہے اور پھر یہ کہہ کر اُمّتِ مسلمہ کی ہمت بندھاتا اور عزمِ نو کا جذبہ اجاگر کرتا ہے۔ع

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

اور ع

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا!

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا — خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے — یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے — کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا!

اور ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اور ؎

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا!

بحیثیتِ مجموعی علامہ اقبال پوری ملّت اسلامیہ کا درد پورے خلوص کے ساتھ محسوس کرتے تھے۔ انہیں اُمّتِ مرحومہ کی بیداری کے ساتھ گہری دلچسپی تھی۔ انہیں کسی ایک خطۂ ارض تک محدود کرنا زیادتی ہوگی۔ اُن کی خواہش تھی کہ کرۂ ارضی پر بسنے والے مسلمان ایک مرکز پر اکٹھے ہو جائیں' پھر اس اتحاد کے نتیجہ میں وہ ہر لحاظ سے فاتح عالم اور قائدِ جہاں بن جائیں۔ مگر جب انہیں اپنی یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہ آتی تو کسی قدر اداسی کا اظہار کرتے۔ ؎

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

علامہ اقبال یگانہ روزگار (Genius) تھے۔ ایسے لوگ وقت سے پہلے پیدا ہو جاتے ہیں اور پھر پوری بیداری میں مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں۔ ان کی بصیرت اس شعر میں ملاحظہ ہو۔ ؎

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اکتوبر ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں بزدل اور بھگوڑے عربوں نے کس جرأت اور جانبازی کا مظاہرہ کیا اور عالمِ اسلام میں اتحاد کی ایک لہر دوڑ گئی اور عربوں کو کسی قدر وقار حاصل ہو گیا۔ پھر اگلے ہی سال عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی جس میں عالمِ اسلام کے اتحاد کا مظاہرہ پورے عالم نے دیکھا۔ اس اجتماع نے کفر کی قوتوں کو چونکا دیا۔ انہوں نے اس کے ردعمل میں مسلمانوں کے اندر افتراق وانتشار پیدا کرنے کی کوششیں بڑی سرگرمی سے شروع کر دیں۔ مسلمانوں کو پہلے بنیاد پرست اور پھر دہشت گرد قرار دیا۔ عالم اسلام کے خلاف

عالمِ کفر کی یہ لہر نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور اسلام دشمن طاقتیں مشینی برتری کے ذریعے مسلمانوں کو نیچا دکھانے میں کامیاب ہوگئیں اور احیائے اسلام کی عالمی تحریک نہ صرف ٹھنڈی پڑ گئی بلکہ پوری دنیا میں مسلمان مجرم اور گردن زدنی ٹھہرے۔ یہ ساری صورتِ حال بھی علامہ کی بصیرت سے اوجھل نہ تھی' اس کے باوجود وہ ٹھنڈی سانس لینے اور کُنجِ عافیت اختیار کرنے سے گریزاں تھے' بلکہ جِدّوجُہد کے ذریعے حالات کو تبدیل کر دینے کے قائل تھے۔ وہ ملت اسلامیہ کو پکار کر کہتے ہیں: ع

بتا رہی ہے یہ ظلمتِ شب کہ صبح نزدیک آ رہی ہے!

چنانچہ آج کے حالات جو بظاہر نہایت حوصلہ شکن ہیں' ملّتِ اسلامیہ کے لئے کامیابی کی نویدِ جانفزا لئے ہوئے ہیں۔ واقعاتِ عالم سے جو تیزی سے رونما ہو رہے ہیں' ہر صاحبِ نظر یہ اندازہ لگا رہا ہے کہ پورے عالم میں رسول اللہ ﷺ کے طریق پر نظامِ خلافت قائم ہونے میں اب صدیاں نہیں لگیں گی۔ کیونکہ کفر خود اپنے آپ کو مٹانے کی جانب پیش رفت کر رہا ہے۔

اقبال کی رموزِ دین سے آگاہی

اقبال سیدھے سادھے مسلمان تھے' مگر دین اسلام کے تقاضوں سے پوری طرح واقف تھے۔ قرآنِ مجید کے ساتھ انہیں والہانہ محبت اور عقیدت تھی' کیونکہ انہوں نے رائج الوقت جدید علوم فلسفہ اور عمرانیات کا گہری نظر سے مطالعہ کر رکھا تھا اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ قرآن مجید کے بیان کردہ حقائق ہر زمانہ میں ناقابلِ تردید رہے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسانیت کی راہ نمائی کے لئے اللہ کے کلام میں پوری صلاحیت موجود ہے۔ وہ عربی زبان ولغت میں مہارت رکھتے تھے' چنانچہ قرآن فہمی کے راستے میں اُن کے لئے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اس کے باوجود اُن کا اس بات پر پختہ یقین تھا کہ قرآنِ مجید کے فہم پر عبور حاصل کرنا کسی فردِ بشر کے بس کا کام نہیں۔

علامہ اقبال نے شعوری طور پر سمجھ لیا تھا کہ قرآن ہی عالمِ انسانیت کی قیادت کر

کے دنیا کو جنّت نظیر خطّہ بنا سکتا ہے۔قرآن فہمی کے اعتبار سے اگر علامہ اقبال کو ترجمان القرآن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔آپ خود اِس بات کے مدّعی ہیں کہ انہوں نے اپنے اشعار کے اندر فکر و پیغامِ قرآن ہی کی ترجمانی کی ہے۔اور انہیں اس بات پر اتنا وثوق ہے کہ مثنوی اسرار و رموز کے آخر میں ''عرضِ حالِ مصنّف بحضور رحمتؐ لِلعالمین ﷺ'' کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا ہے:۔

گر دلم آئینۂ بے جوہراست ۔۔۔ ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ۔۔۔ ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا!

بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا!

''اگر میرے دل کا آئینہ صاف نہیں اور اگر میرے الفاظ میں قرآن کے علاوہ کوئی اور بات ہے تو اے اللہ! میرے خیالات کو قبولِ عام نہ دے اور اس راستے سے مجھے اس طرح الگ کر دے جیسے خارِ راہ کو راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔(اگر میں نے قرآن کی تعلیمات کے خلاف باتیں کی ہوں) تو مجھے محشر کے دن ذلیل و خوار کر دینا اور مجھے رسول اللہ ﷺ کے قدموں کا بوسہ لینے کی بھی اجازت نہ دینا۔''

علامہ کو جو محبّت اسلام اور قرآن کے ساتھ تھی ان اشعار کے پڑھنے سے اُس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔آخری شعر پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس بات کا کس قدر یقین تھا کہ انہوں نے اپنے کلام کے اندر قرآن ہی کی ترجمانی کی ہے۔

علامہ اقبال مذہب کا خشک تصور نہیں رکھتے تھے۔وہ دین کی تشریح و تعبیر میں حسین امتزاج اور اعتدال کے قائل تھے۔احکامِ دین کے سلسلہ میں وہ روحِ دین کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔عبادات کی اہمیت تو اپنی جگہ مسلّمہ ہے لیکن علامہ اقبال کے نزدیک عبادات نتیجہ خیز ہونی چاہئیں۔اگر عبادات مثلاً نماز اور روزہ انسان کو اچھا نہیں بناتے تو اُن کا فائدہ؟ وہ مسجد کے کسی کونے میں بیٹھ کر ذکرِ الٰہی میں ہمہ وقت مصروفیت کو روحِ دین کے خلاف سمجھتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ عبادت کا یہ انداز مسنون نہیں ہے۔اُن کے

نزدیک زندگی ہمہ تن جِدّ و جُہد کا نام ہے۔ کیونکہ جب زندگی میں جمود آ جائے تو وہی موت ہے۔ وہ مسلمان کی بے حس زندگی پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ع

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا!

یعنی جب قوم کو بیدار کرنے' آگے بڑھانے اور غالب کرنے کا تقاضا ہو اُس وقت تن آسانی کے ساتھ اللہ کے ذکر میں مشغولیت کی اجازت نہیں۔ بلکہ مسلمان تو رات کے راہب اور دن کے مجاہد ہوتے ہیں۔ رات کو وہ عبادت میں مشغول اپنے ربّ کے ساتھ راز و نیاز کرتے ہیں جبکہ دن کے وقت وہ چاک و چو بند مجاہد ہوتے ہیں۔

فلسفۂ خودی

علامہ اقبال انسان کو خالق کی شاہکار تخلیق تسلیم کرتے ہیں' اس لئے وہ انسان کے مقام بلند سے بھی واقف ہیں۔ وہ مسجودِ ملائک ہے اور ملائکہ اللہ تعالیٰ کی نورانی' معصوم اور پاکیزہ مخلوق ہیں۔ پس جو اُن کا مسجود ہو اس کا مقام کتنا بلند ہو گا۔ اس لئے علامہ کا زور اس بات پر ہے کہ انسان احکام خداوندی پر پیہم عمل پیرا ہو کر اشرف المخلوقات کے منصب پر فائز رہے نہ کہ اشرفیت کے تقاضوں کو فراموش کر کے حیوانیت کے پست ترین مقام تک گر جائے۔ علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی بنیاد یہی نظریہ ہے۔ اسی لئے ان کی منزل فنا فی اللہ نہیں بلکہ بقا باللہ ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ انسان کا مقصود خدا یا حیاتِ کُلّی میں جذب ہو جانا اور اپنی ہستی کو مٹا دینا نہیں بلکہ احکامِ خداوندی کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی ذات کو قائم رکھنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان خدا کی ذات میں فنا نہ ہو جائے بلکہ خدا کو اپنے اندر جذب کر لے' یعنی خدائی صفات کا حامل بن کر خلیفۃ اللہ کے منصب کا اہل ثابت ہو۔ کیونکہ اگر انسان خود اپنے مقام و مرتبہ اور صلاحیتوں سے آگاہ نہ ہو' بلکہ اپنے آپ کو خود ہی کسی اہمیت کا حامل نہ سمجھے تو وہ کیسے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام دے سکتا ہے اور ستاروں پر کمند کیسے ڈال سکتا ہے!

اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو وجودِ خاکی میں ڈھالا تو اس میں اپنی روح میں سے پھونکا۔ اس روحِ ربّانی نے روحِ انسانی کو حقیقی' واقعی' قائم و دائم اور اشرفیت کے مقام

پر فائز کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ روحِ انسانی کے اس قرب وتعلق کو استوار کرنا ہی دراصل معرفتِ خود ہے جسے اقبال خودی کا نام دیتا ہے۔ اور جو یہ منزل حاصل کر لیتا ہے اسے معرفتِ خداوندی بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی کو صوفیاء نے اس طرح بیان کیا ہے کہ **مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ** ''جس نے اپنا مقام ومرتبہ پہچان لیا گویا اسے معرفتِ ربّ حاصل ہو گئی''۔ یہی وجہ ہے کہ کلامِ اقبال میں خودی کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ کیونکہ اپنی صلاحیتوں سے واقف ہوئے بغیر انسان کوئی قابلِ ذکر کام انجام دے ہی نہیں سکتا' بلکہ کسی مہم پر آگے بڑھنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

خودی کی پہچان انسان کا اپنے خالق کے ساتھ رشتہ مضبوط کر دیتی ہے اور تعلّق کی اسی مضبوطی کا نام محبّت ہے۔ دیکھئے اہل ایمان کے بارے میں قرآن مجید میں آتا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (البقرۃ: ۱۶۶)

پھر یہ محبت دوطرفہ ہو جاتی ہے کہ اللہ بھی محبت کرتا ہے ان لوگوں سے جو اُس کی راہ میں محبت کے تقاضے پورے کرتے ہوں۔ عشقِ خداوندی کے معاملے میں اقبال وصل کی نسبت شوقِ وصل کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں' کیونکہ منزل پر پہنچ کر شوقِ سفر ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ ہمہ وقت عشقِ الٰہی کی مستی میں دم بخود رہنا پسند کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام!

''تو ابھی اس راز سے آگاہ نہیں ہوا کہ وصل سے شوق ختم ہو جاتا ہے۔ (کاش کہ تو جان لے کہ) ہمیشہ کی زندگی کیا ہے؟ مسلسل سلگتے رہنا! (نہ کہ ایک بار بھڑک کر ختم ہو جانا!)''

غرض اقبال تمام زندگی شوقِ وصال یعنی عشق الٰہی میں گزارنا چاہتا ہے۔ وہ محض علامتی عبادت کا قائل نہیں بلکہ وہ عبادت کو پوری روحانی توجہ سے ادا کرنا چاہتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ عبادت کا مقصد بھی یہی ہے' جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے کہ نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے بچاتی ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب نماز

پڑھنے والا شوقِ وصال کے جذبے سے مصروفِ عبادت ہو۔ وہ کہتے ہیں:

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا سجود بھی حجاب، میرا قیام بھی حجاب!

یا پھر

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

وہ اس نمازی مسلمان کو روحانیت سے خالی گردانتے ہیں جو رسمی رکوع وسجود میں مشغول ہو۔ وہ کہتے ہیں:

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اسی لئے اقبال دنیا میں رونما ہونے والے تمام نمایاں کارناموں میں عشق ہی کو کارفرما سمجھتے ہیں، کیونکہ عشق ہی وہ قوت ہے جو ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

حُبِّ رسول

علامہ اقبال اطاعت رسول ﷺ کو عشقِ الٰہی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ یہی صراطِ مستقیم ہے، یہی دینِ مبین ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ﴾

یعنی اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو رسول ﷺ کا اتباع کرو۔ کیونکہ جو رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ گویا اللہ ہی کی اطاعت کرتا ہے۔

﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾

اور اطاعت محبت کے بغیر نہیں ہوتی، اور اگر بالفرض ہو تو ریاکاری، نمود و نمائش اور بے روح ہوگی۔ پس اطاعتِ رسول ﷺ کے لئے حبِّ رسول ﷺ کا ہونا ضروری

ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ ؐ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

''جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کی دولت حاصل ہے تو گویا دنیا کا کل خشک وتر اس کے دامن کے ایک گوشے میں موجود ہے۔''

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

''خود کو درِ مصطفیٰ ﷺ تک پہنچا کر دم لو' اس لئے کہ اگر تم اس مقام تک نہ پہنچ سکے تو سمجھ لو کہ پھر بولہبی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آ سکے گا!''

اسلام۔ دینِ توحید

علّامہ اقبال نے عقیدۂ توحید کو دین کی جڑ اور بنیاد قرار دیا ہے۔ اسی سے شجرِ دین پھوٹتا اور نشو ونما پاتا ہے۔ اگر کہیں عقیدہ ہی کمزور ہے تو اس بیج سے صراطِ مستقیم کا پودا جنم نہیں لے سکتا' جبکہ توحید پر پختہ ایمان انسان کو ثابت قدم رکھتا اور طمانیت کی دولت سے مالا مال کرتا ہے' اس کے یقین کو مضبوط کرتا اور عمل کو راسخ کرتا ہے۔ توحید کے حیاتِ انسانی پر جو صحت آفریں اثرات پڑتے ہیں علامہ اقبال اُن کی تحسین کرتے ہیں۔

وحدتِ خالق کی بنیاد پر انسانیت میں اخوت کا جذبہ اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وحدتِ خالق کا مطلب ہے کہ ہر انسان کا خالق ایک ہی ہے خواہ وہ انسان کالا ہو' گورا ہو' امیر ہو' غریب ہو' دنیا کے کسی خطے میں رہتا ہو' کوئی زبان بولتا ہو' اچھا ہو برا ہو' کسی بھی تہذیب سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ عقیدہ انسانوں میں یگانگت اور اپنائیت کا احساس پیدا کر کے محبت اور پیار کے جذبات ابھارتا ہے' دشمنیاں مٹتی ہیں' دوستیاں پروان چڑھتی ہیں' امن وامان قائم ہوتا ہے' دنگا فساد ختم ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

کُلُّ مُؤمِن اِخوَۃٌ اندر دلش
حریت سرمایۂ آب و گِلش

ناشکیبِ امتیازات آمدہ
در نہادِ او مساوات آمدہ

''اس کے (یعنی بندۂ مومن کے) دل میں یہ حقیقت جاگزیں ہے کہ تمام اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں! اسی طرح جذبۂ حریت بھی اس کے ضمیر میں رچا بسا ہوا ہے' وہ (نسلی' لسانی یا علاقائی) امتیازات سے بالکل ناواقف ہے اور مساوات اس کی سرشت میں موجود ہے!''

توحیدِ باری تعالیٰ حاکمیت کا ایک تصور پیدا کرتی ہے۔ اگر سب لوگ ایک اللہ کے بندے ہیں تو سب کا حاکم بھی ایک ہی ہوا۔ اسی ایک کے حکم کے سامنے سب گردن جھکا دیں گے۔ اسی طرح سیاسی اعتبار سے سب لوگوں کا ایک حاکم پر اتفاق ہو جائے گا' اسی کا حکم مانا جائے گا' اس کے حکم کی موجودگی میں کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت کا مطلق جواز نہ ہوگا۔ حاکمیتِ مُطلقہ کے اس تصور کے خلاف دنیا میں وطنی قومیت کا تصور رائج اور ہر دل عزیز ہو رہا ہے۔ علامہ اس مہلک غلط فہمی کا شدت سے احساس کرتے ہوئے راہِ راست کی تلقین کرتے ہیں۔ اقبال لکھتے ہیں: ؎

اس دور میں مے اور ہے' جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تُو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے!

اسی طرح معاشی نظام میں توحید کے اصول کو اپناتے ہوئے علامہ اقبال تمام دیگر نظاموں کو بے انصافی پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ وہ اسلامی اصول ملکیت کی بالادستی پر گہرا یقین رکھتے ہیں' جس کی رو سے ہر شے کا مالک حقیقی دراصل اللہ ہے۔ ساری زمین اللہ

کا ملک ہے لہٰذا اللہ کی ملکیت ہے۔ قرآن شریف میں موجود ہے کہ ہر چیز کا مالک اللہ ہے۔ حتیٰ کہ جو چیزیں انسانوں کی انفرادی ملکیت میں ہیں ان کا مالک بھی درحقیقت اللہ ہی ہے۔ خود انسان بھی اللہ ہی کی ملکیت ہے' بلکہ اس کی تمام صلاحیتیں بھی اللہ ہی کی عطا کردہ اور امانت ہیں۔ ان چیزوں اور صلاحیتوں کے استعمال میں انسان کو اختیار تو دیا گیا ہے لیکن اُسے جگہ جگہ تنبیہہ کر دی گئی ہے کہ کسی بھی چیز پر اپنی ملکیت مطلقہ کا دعوے دار نہ ہو جائے۔ ملکیت کے بجائے امانت کا یہ تصور توحید کا لازمی نتیجہ ہے۔ بقول شیخ سعدی ع

این امانت چند روزہ نزدِ ما است
درحقیقت مالک ہر شے خدا است

''یہ (میرا جملہ مال واسباب دنیوی) میرے پاس ایک عارضی امانت ہے' ورنہ ہر شے کا مالک حقیقی تو خدا ہی ہے۔''

علامہ اقبال جاگیردارانہ نظام کو ظلم و استبداد سے تعبیر کرتے ہیں اور یہی عین اسلامی تعلیم ہے' کیونکہ اسلام میں ناجائز ذرائع سے دولت کمانا جائز نہیں۔ پھر جائز طریقہ سے دولت کمانا مگر اسے جمع کر کے رکھنا بھی درست نہیں' بلکہ مال دار کو کہا گیا ہے کہ تمہاری دولت میں ناداروں اور کمزوروں کا حق ہے جو اُن کو پہنچانا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اگر صاحبِ ثروت اس حق کی ادائیگی نہیں کرتے تو وہ سخت گنہگار ہیں۔ یہ صورت حال علامہ کو خون کے آنسو رلاتی ہے کہ کارخانہ دار اپنی تجوریاں بھرتا جائے اور مزدور مفلوک الحال ہی رہے' یا زمیندار مزارع کی مشقت پر عیش وعشرت کی زندگی بسر کرے اور کسان عسرت اور بے چارگی کا شکار رہے' جبکہ محنت کسان کی ہو اور کھیتی اللہ تعالیٰ پیدا کرے۔ قرآن میں آتا ہے ﴿لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی﴾ تو جو زمین میں محنت نہیں کرتا وہ اس کی پیداوار کا مستحق کیسے بن گیا۔ علامہ کہتے ہیں کہ متوازن نظامِ معیشت اسلام ہی کا عطا کردہ ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں!

بندۂ مؤمن امیں حق مالک است
غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است

''بندۂ مومن (اپنے مال ومتاع کا صرف) امین ہے' مالک خدا ہے۔ خدا کے سوا جو کچھ دیکھتے ہو سب فانی اور ہلاک ہو جانے والا ہے!''

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دِہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

''کارخانہ دار تو مزدور کی خون پسینے کی کمائی سے جواہرات میں کھیلتا ہے اور زمیندار کے ظلم سے کسان کی مٹی پلید ہوتی ہے۔''

اس ضمن میں وہ انقلاب کا نعرہ لگاتے ہیں اور زمیندار کو جھنجھوڑتے ہیں اور کاشتکار کو وصولیٔ حق پر ابھارتے ہیں:ـ

دِہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں' تیری نہیں
تیرے آباء کی نہیں' تیری نہیں' میری نہیں!

اور پھر ع

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو!

آج کے رائج الوقت معاشی نظام کی بنیاد سود پر ہے۔ اور سود اسلام میں حرام ہے' بلکہ اسلام تو دولت کو اللہ کی راہ میں اور مساکین اور حاجت مندوں پر خرچ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اقبال اس تصور کی دل وجان سے حمایت کرتا ہے اور قرآن کے الفاظ قُلِ الْعَفْوَ کی ترجمانی کرتا ہے:ـ

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ
ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

''رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے کہا کہ جان ہتھیلی پر رکھ لیں (یعنی قتال فی سبیل اللہ کے لئے کمر کس لیں) اور جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو وہ سب (اللہ کی راہ میں) دے ڈالیں!''

پھر وہ کہتے ہیں:ـ

ہیچ خیر از مردکِ زر کش مجو !
لَنْ تَنالُوا البِرَّ حتّٰی تُنْفِقُوْا

''دولت سمیٹنے والے سے کسی بھلائی کی توقع نہ کرو۔ (اس لئے کہ قرآن نے صاف فرمادیا ہے کہ) تم نیکی کا مقام ہرگز حاصل نہیں کر سکتے جب تک (بجائے سمیٹنے اور جمع کرنے کے) خرچ کرنے کی عادت نہ ڈالو۔''

پھر وہ کہتے ہیں:۔

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن!
کس نداند لذّتِ قرضِ حَسَن
از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ
آدمی درّندہ بے دندان و چنگ

''سود سے سوائے فساد کے اور کس چیز میں اضافہ ہوسکتا ہے؟ (افسوس کہ) بغیر سود قرض دینے کی لذت کسی کو معلوم نہیں!
سود سے روح تاریک اور دل اینٹ پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے اور انسان بغیر دانتوں اور پنجوں کے درندہ بن جاتا ہے۔''

قرآن اور اقبال

علامہ اقبال جس طرح رسول اللہ ﷺ کو محبوب جانتے تھے اسی طرح کتاب اللہ کی عظمت و جلالت کے واقعی شناسا تھے۔ وہ قرآن کو سرچشمہ ہدایت مانتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ جس طرح قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے قرآنی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کی اور سارے عالم پر چھا گئے' آج بھی اگر مسلمان قرآن کے راہ نما اصول اپنالیں تو قائد عالم بن سکتے ہیں۔ انسان کی حقیقی کامیابی کے لئے قرآن کافی ہے۔ حیاتِ دُنیوی میں جس نظام کے لئے راہ نمائی مطلوب ہو قرآن کی آیات وہاں کفایت کرتی ہیں' خواہ وہ معاشی نظام ہو یا سیاسی نظام' معاشرتی نظام ہو یا نظامِ تعلیم۔

علامہ اقبال نے اپنے دَور کی اعلیٰ ترین سطح کی تعلیم حاصل کی' انسانی تہذیب و تمدن کی اونچ نیچ کو دیکھا' قدیم و جدید فلسفے کو پڑھا' وقت کی غالب تہذیبوں کو اپنی آنکھ

سے دیکھا، مگر آخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ حیاتِ دُنیوی میں سکون و اطمینان قرآن کی تعلیمات کے علاوہ اور کہیں نہیں۔ اُن کے نزدیک طائفہ انسانیت کو صحیح سمت میں صرف قرآن ہی چلا سکتا ہے اور صرف یہی ھُدیً لّلنّاس ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی عظمت اور مقام اقبال پر الہام ہوئے ہیں، کیونکہ وہ قرآن پاک کے جلال و جمال کو حقیقی طور پر محسوس کرتے ہیں۔ قرآنِ مجید کو وہ بے نظیر و بے مثل کتاب قرار دیتے ہیں اور اِس کی عظمت و جلالت کے سامنے بچھے جاتے ہیں:

آں کتابِ زندہ، قرآنِ حکیم — حکمتِ او لا یزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوّتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے، تبدیل نے — آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخریں — حاملِ او رحمۃٌ لّلعالمیں
رہزناں از حفظِ او رہبر شدند — از کتابے صاحبِ دفتر شدند
آنکہ دوشِ کوہ بارش بر نتافت — سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں — زندہ و پائندہ و گویاست ایں
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

''وہ زندہ کتاب ''قرآن حکیم''، جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی! زندگی کے وجود میں آنے کے رازوں کا خزینہ، جس کی حیات افروز اور قوّت بخش تاثیر سے بے ثبات بھی ثبات و دوام حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے الفاظ میں نہ کسی شک و شبہ کا شائبہ ہے نہ ردّ و بدل کی گنجائش اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔ نوعِ انسانی کے لئے (خدا کا) آخری پیغام، جس کے لانے والے تمام جہانوں کے لئے رحمت قرار پائے (صلی اللہ علیہ وسلم) اسے یاد کر لینے کے باعث یا اس کی حفاظت میں آ کر رہزن اور لٹیرے رہبر و رہنما بن گئے اور اس کتاب کے طفیل وہ خود بہت سی کتابوں کے مصنف بن گئے! وہ (کتاب) جس کے بوجھ کو پہاڑ بھی نہ اٹھا سکے اور جس کے دبدبے سے آسمان

کا پتہ بھی پھٹ کر رہ گیا! (اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے! یہ ذات حق سبحانہ وتعالیٰ کا کلام ہے لہٰذا اسی کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی! اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے لئے ایک ایک لمحے میں بے شمار زمانے موجود ہیں!''

علّامہ اقبال کے مندرجہ بالا اشعار پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے کلام کو انسانیت کے لئے واحد نسخہ حیات جانتے تھے۔ اسی کتاب کا اعجاز ہے کہ اخلاق سے عاری معاشرے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے صاحبِ جلال وکمال لوگ پیدا ہو گئے اور اُس ردّی معاشرے کی کایا پلٹ گئی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کتاب کبھی Out dated ہونے والی نہیں' وہ ہر زمانے کے تقاضوں پر پوری اترنے والی کتاب اور ہر قسم کے حالات میں راہ نما اصول دینے والی تعلیم پر مشتمل ہے۔ یہ اللہ کا کلام ہے' جس طرح ذاتِ باری تعالیٰ ہر طرح کے نقص اور کمزوری سے پاک ہے اسی طرح اس کا کلام بھی کسی قسم کی بوسیدگی کا شکار نہیں ہوسکتا' بلکہ ہر دور میں نئے نئے پیدا ہونے والے مسائل کا بہترین حل پیش کرتا ہے۔

مسلمانوں نے غفلت کو شعار بنالیا اور قرآنِ مجید سے اپنا تعلق کمزور کرلیا' جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان مغلوب اور ذلیل وخوار ہو گئے' اقوامِ عالم کی نگاہ میں مسلم اُمہ کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ عام مسلمانوں کا تو کیا کہنا علماء نے بھی لوگوں کو فقہی مسائل میں الجھائے رکھا اور قرآن سے دُور کرتے گئے۔ حالت یہاں تک پہنچی کہ مسلمان کا قرآنی تعلیمات سے کوئی واسطہ نہ رہا اور قرآن محض عقیدت کی ایک علامت اور تقدس کا مظہر ٹھہرا' برکت کے لئے تلاوت کیا جاتا' ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر اونچی جگہ پر رکھا جاتا' قسمیں اٹھانے کے لئے استعمال کیا جاتا' اس کے الفاظ پر مشتمل تعویذ لکھے جاتے' آیاتِ قرآنی کو من پسند معنی دیئے جاتے۔ اُمت کی اس حالت نے علامہ اقبال کو خون کے آنسو رلایا۔ وہ اُمت کی اس پستی کا واحد سبب قرآن سے دوری قرار دیتے ہیں۔ وہ

کہتے ہیں کہ ؎

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

وہ اُمتِ مرحومہ کو قرآن کی طرف پلٹنے کی دعوت دیتے ہیں اور اسی میں کامیابی سمجھتے ہیں۔

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی ‎ ‎ شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ ‎ ‎ در بغل داری کتابِ زندۂ
اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو ‎ ‎ شیوہ ہائے کافری زندانِ تو!
قطع کردی اَمرِ خود را در زُبُر ‎ ‎ جادہ پیمائی اِلٰی شَیٔءٍ نُکُر
گر تو می خواہی مسلماں زیستن ‎ ‎ نیست ممکن جز بقرآن زیستن

از تلاوت بر تو حق دارد کتاب
تو ازو کامے کہ می خواہی بیاب!

''(اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دور اور بے تعلق ہو گیا ہے' لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے! اے وہ قوم کہ جو شبنم کے مانند زمین پر بکھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے)! اٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتاب زندہ موجود ہے! (جس کے ذریعے تو دوبارہ بامِ عروج پر پہنچ سکتی ہے!) اے مسلمان! تیرا ایمان رسومات کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے اور تو خود کفر کے طور طریقوں کے زندان میں اسیر و مقید ہے! تو نے اپنی وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کر لیا ہے اور اب ایک خوفناک انجام کی طرف تیزی سے رواں دواں ہے! (اب) اگر تو (دوبارہ) مسلمان ہو کر جینے کا خواہش مند ہے تو (اچھی طرح جان لے کہ) اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنی حیاتِ نو کی بنیاد قرآن پر قائم کرے! اس کتاب کا حق تلاوت تم ادا کرو' پھر جو مقصد و مطلب چاہو حاصل کر لو۔''

وہ خاص طور پر علماء کو یاد دہانی کراتے ہیں کہ وہ ''خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں ـــــ ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق'' کا انداز چھوڑ کر قرآن کی خالص

تعلیمات کو عام کرنے کا طریقہ اختیار کریں' کیونکہ اُمت کی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے یہی ایک راستہ ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم   تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم؟
درجہاں اسرارِ دیں را فاش کن   نکتۂ شرع مبیں را فاش کن!

''اے وہ شخص یا قوم جسے حاملِ قرآن عظیم ہونے پر فخر ہے! آخر کب تک حجروں اور گوشوں میں دبکے رہو گے؟ (اٹھو اور) دنیا میں دین حق کے اسرار و رموز کو عام کرو اور شریعت اسلامی کے رموز و حکم کی تشہیر و اشاعت کے لئے سرگرم ہو جاؤ۔''

الغرض علامہ کے نزدیک اُمّت کے جملہ امراض کے لئے شفا بخش نسخہ صرف قرآنِ حکیم ہے اور ملّت کے مُردہ جسم میں از سرِ نو جان ڈالنے کے لئے آبِ حیات بھی قرآن ہی فراہم کرتا ہے۔

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات   در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
می دہد ما را پیامِ لا تَخَفْ   می رساند بر مقامِ لا تَخَفْ
گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام   شرحِ رمزِ صبغتُ اللہ گفتہ ام
پس بگیر از بادۂ من یک دو جام   تا درخشی مثلِ تیغِ بے نیام!

''(اے مسلمان!) اگر دوام و ثبات اور قوّت و استحکام کا طالب ہے تو قرآن کے سامنے دست سوال دراز کر۔ اس لئے کہ مجھے قرآن ہی کے مخفی چشموں میں آبِ حیات کا سراغ ملا ہے۔ یہ ہمیں بےخوفی کا پیغام ہی نہیں دیتا' بالفعل اس مقام تک بھی پہنچا دیتا ہے جہاں نہ خوف باقی رہتا ہے (نہ حزن!) میں نے قرآن کے بحرِ بیکراں کے موتی بیندھ لئے ہیں اور ''صبغۃ اللہ'' کے اسرار و رموز کی شرح بیان کر دی ہے۔ پس (اگر خدا توفیق دے تو) میری شراب کے ایک دو جام چڑھا' یعنی میرے فکر اور پیغام سے سرشار ہو کر آمادۂ عمل ہو جا تاکہ تو شمشیر برہنہ کے مانند چمکنے لگے!''

اور ع

از یک آئینی مسلماں زندہ است   پیکرِ ملّت ز قرآں زندہ است!

(باقی صفحہ ۷۱ پر)

وحدتِ ادیان

اسلام کے خلاف مکروہ سازش

تحریر: ڈاکٹر نور احمد شاہتاز

''وحدتِ ادیان'' ایک ایسا پُر فریب نعرہ ہے جس کا شکار وہ لوگ تیزی سے ہو رہے ہیں جنہیں ہمارے ہاں اونچی سوسائٹی کے لوگ یا مراعات یافتہ طبقہ کہا جاتا ہے۔ اور صرف ہمارے ہاں یعنی پاکستان میں نہیں بلکہ دنیا کے تمام ترقی پذیر اور خصوصاً اسلامی ممالک میں یہ اصطلاح تیزی سے اس طبقے میں پھیلائی جا رہی ہے جو اپنے مالی' کاروباری' سیاسی یا بیوروکریٹک اثر ورسوخ کی وجہ سے اقتدار کے ایوانوں کے قریب یا ان پر مسلط رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈپلومیٹک (سفارتی) سٹاف اور فارن مشنز (Foreign Missions) میں کام کرنے والے لوگوں میں بھی اس کا چرچا عام ہے۔ بعض ممالک میں بعض تنظیموں نے چند قدم آگے بڑھ کر اس حوالہ سے کانفرنسوں اور سیمینارز کا اہتمام بھی کیا ہے۔ اس اصطلاح کے موجدوں اور اس کی ترویج و اشاعت کے ذمہ داروں کا اگلا ہدف یونیورسٹیاں اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے ہیں' جہاں تعلیمی کیڈر سے تعلق رکھنے والے آزاد خیال لوگوں کو بطور ایجنٹ استعمال کرنے اور اس مکروہ نعرہ کو مقبولِ عام بنانے کے لئے کام شروع کر دیا گیا ہے اور بعض ملکوں میں (بشمول پاکستان کے بعض شہر) اندر ہی اندر یہ کام شروع ہو چکا ہے۔ اب اساتذہ اور پڑھے لوگ پبلک مقامات اور انٹر یونیورسٹی (اندرون جامعات) ہونے والی تقاریب میں مل بیٹھنے اور چائے وریفرشمنٹ کے وقفوں میں اس پر گفتگو کرنے لگے ہیں۔

یوں تو وحدتِ ادیان پر گزشتہ نصف صدی سے وقتاً فوقتاً مختلف ممالک میں شوشے چھوڑے جا رہے ہیں مگر نئے انداز سے ''وحدتِ ادیان'' کا تصور اس نیو ورلڈ آرڈر کا پیش کردہ ہے جسے دورِ حاضر کا بدنام زمانہ منصوبہ کہا جانا چاہئے۔ اس تصور کو عام کرنے